جواں فارسی غزل کی بزرگ شاعرہ سیمین بہبہانی

ڈاکٹر نوید احمد گل☆
Dr. Naveed Ahmed Gull

Abstract:

Simeen-e-Behbahani (20-06-1927____19-08-2014Ad) represents modern tends of Persian prose and poetry. She was great Ghazal-Poet in the latest Persain-literture. She was not Neemai-Ghazal according to her as Dr. Haqshnas siad. In her Ghazal she Seems near and dear to Hifz (1390Ad) and her contemparay M.H. Shehryaar (1988Ad). So she can be said Shehrbanw-e-Sukhan (The queen of modern persain literture) of latest persain Ghazal. She cherishes a style of her own. She seems to be sharing the artistic grandeur of Ghalib (1869Ad) and Iqbal (1938Ad) as she doesn`t believed in literary cosmetical superficiality of thought and craft. In this easy a glimpse of her life history and her philosophy of life as reflected in her literary works is given.

Key Words:

Simeen-e-Behbahani, Hafiz Shehr Yaar, Ghalib Iqbal, Ghazal.

کلیدی کلمات:

سیمین بہبہانی، غزل، حافظ، شہریار، غالب اور اقبال۔

خلاصہ

سیمین بہبہانی (۲۰۱۴ء) کا شمار جدید فارس غزل کی انتہائی معتبر شاعرات میں کیا جاتا ہے۔ وہ ایک صاحبِ طرز شاعرہ تھیں جو نیمایو شیج کے اسلوب سے جدا گانہ ہے۔ ان کا رنگ غزل ایران کے حوالے سے خواجہ حافظ (۱۳۹۰ء) اور محمد حسین شہریار (۱۹۸۸ء) جبکہ پاک و ہند کے حوالے سے غالب (۱۸۶۹ء) اور اقبال (۱۹۳۸ء) کے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔

سیمین بہبہانی (۲۰۱۴ء-۰۸-۱۹، ۱۹۲۷ء-۰۶-۲۰) کے پاس فارسی غزل بہت سارے مرحلے طے کر کے پہنچی جس میں مزید تراش خراش کی کوئی گنجائش بظاہر نظر نہیں آتی تھی لیکن سیمین نے اپنی جدت طبع اور خونِ جگر سے اس کی وہ نگار گری کی کہ جدید فارسی غزل کو کنیا سے کامنی بلکہ رانی روپ متی بنا ڈالا جس کا اظہار وہ اکثر کرتی رہی ہیں۔ اس مضمون میں سیمین کی ان

کوششوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ سیمین کا ذاتی میلانِ طبع نثر اور نظم کی نسبت غزل کی طرف ہے۔ اس میلان کا اظہار سیمین نے کئی بار کیا ہے: ”مجھے اپنی بات غزل کے پیرایہ میں کرنا اچھا لگتا ہے۔ مجھے غزل کی ہلچل سے پیار ہے۔ میں اس رُکی ندی کو پھر سے زندہ اور فعال بنانا چاہتی ہوں۔ میں غزل کی پوشاک میں جینا اور غزل کے کفن میں دفن ہونا چاہتی ہوں۔ اسے محض عاشقانہ رنگ سے باہر نکال کر معاشرتی موضوعات سے مملو کرنا چاہتی ہوں۔ مگر اس کام کے لیے کوشش، مشق اور کسی قدر انتظار کی ضرورت ہے۔ میں تو جدت پر جان دیتی ہوں مگر یہ جدت محض نہ ہو۔“من بہ زبان روز سخن گفتم نہ زبانی کہ پیش از ہفت قرن، خاصِ غزل بود۔“ میں تو ہر وقت اپنے تخیل کو اپنے وضع کردہ نظامِ لغات میں ڈھالنے کے جتن کرتی رہتی ہوں۔“(۱)

سیمین کا اپنا نظریہ (نظام) وزن و عروض ہے۔ اس کے خیال میں ”ذوقِ سلیم لازم ہنر است“ اور اگر انسان ٹھان لے کہ میں نے نیا کہنا ہے اور موزوں بھی تو یہ کام ہو سکتا ہے یہ سچ ہے کہ ”ہر تجربہ تازہ ای باذھن ہای آسان طلب غریبی می کند(۲)۔ مگر میں (سیمین) نے یہ کام کیا ہے اور کر لیا ہے: ”من صَرفِ گریز از ابتذال و تکرارِ مکررات کردہ ام۔“(۳)

محمد حقوقی سیمین کی غزل سرائی کے بارے میں سیمین کی تائید میں لکھتے ہیں: ”سیمین کی غزل کو بجا طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلے حصے میں ”سہ تارِ شکستہ“، ”جای پا“، ”چلچراغ“ اور ”مرمر“ کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ دوسرے حصے میں ”رستاخیز“، ”خطی زِ سرعت واز آتش“ اور ”دشت ارژن“ شامل ہیں۔ پھر محمد حقوقی نے دوسرے حصے کو سیمین کے فکر و فن کے حوالے سے مزید چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے کو فکر کے حوالے سے سماجی حصہ قرار دیا ہے جبکہ دوسرے کو فنی، تیسرے کو ہئیتی اور چوتھے کو عروضی تبدیلیوں کا حصہ قرار دیا ہے۔ سیمین نے اپنے دوسرے دورِ شاعری میں ”قد سرو“، ”لبِ لعل“، ”کمان ابرو“ جیسے تراکیب کو چھوڑ کر ”سپیدہ نقرہ پرداز“، ”تحریر بال کبوتر“، ”ملیلۂ سیمین“، ”یم ہای خامش بارانی“، ”نور مستقام مغرب“، ”برق کبریت خشم“، ”پنجۂ تاریکی“، ”گلابی روشن“، ”تاراجگاہ ایام“ جیسی تراکیب کو غزل میں شامل کیا ہے۔ سیمین نے غزلِ مسلسل کی بازیافت کی ہے۔ سیمین کو بحر رجز، ہزج، رمل، نہایت پسند ہیں۔“(۴)

سیمین نے مترنم اور نغمہ ریز بحور کے ساتھ ساتھ سنگلاخ بحور میں بھی کامیاب غزلیں کہی ہیں۔ ادق ردیفوں مشکل قوافی کے ساتھ غزل سرائی کے کامیاب تجربے بھی کیے ہیں۔ لفظی سطح پر

اس کا کلام بہت فصیح ،ادبی، سلیس اور رواں ہے۔ اس کی عمومی زبان کو غزل سے ایک خصوصی مناسبت بھی ہے۔ عامیانہ لفظوں، محاوروں اور ترکیبوں کو اس نے نہ اپنی غزلوں میں برتا ہے نہ نظموں میں حتیٰ کہ ان نظموں میں بھی جہاں موضوع بازاری ہے۔

حسنِ ترکیب اور جدتِ تشبیہ و استعارہ سیمین کے کلام کی جان ہے۔ جدید حیثیت غزل میں بڑی نمایاں ہے۔ معاصر سماج اور عہدِ جدید کے مسائل کو فارسی غزل کا موضوع بنایا ہے۔ بہت سے ایسے مفاہیم غزل میں بیان کیے ہیں جن کی مثال موجود نہیں ہے۔ فکری تسلسل کی حامل غزلیں بھی ہیں۔ واقعاتی غزلیں بھی ہیں جنہیں معنوی طور پر نظمیں کہا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حق شناس نے سیمین کو ''نیمائے غزل'' کا خطاب دیا ہے(۵) جبکہ سیمین نے اس کی نفی کی ہے اور اس میں نثری شاعری نہیں کی۔ اس کا کلام بے وزن نہیں نَو وزن ہے غیر موزوں نہیں بلکہ نو موزوں ہے اور یہ ترقی ہے انحراف نہیں، جدت ہے بغاوت نہیں، ہمراہی ہے تقلید نہیں، ذاتی ہے مستعار نہیں، نیا ہے، فرسودہ نہیں، مطبوع ہے کلیشے نہیں۔ سیمین نے اپنے تمام متقدمین اور معاصرین سے شاعری اور نثر دونوں میں فیض اندوزی کی ہے اور ان سے بے پناہ احترام اور پیار کا بار بار اظہار کیا ہے۔ ان میں مہدی اخوان ثالث (۱۳۶۹ھ)، نادر نادر پور (پ ۱۳۰۰ھ)، سہراب سپہری(۱۳۵۹ھ)، جلال آلِ احمد(۱۳۴۸ھ)،خانمِ سیمین دانشور(پ ۱۳۰۰ھ)، نیمایوشیج (۱۹۵۹ء)، پروین اعتصامی، خواجہ شیرازا(۷۹۱ھ)اور سعدی شیرازی(۶۹۱ھ) خاص طور پر قابل ذکر ہیں مگر وہ سراسر کسی کی مقلد نہیں وہ خود کہتی ہے کہ میں اگرچہ خود سر ہوں اور میں نے فارسی کی روایتی غزل سے ایک جداگانہ روش نکالی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ میں نے نیما کی راہ اختیار نہیں کی اور بے وزن شاعری شروع نہیں کر دی۔ ''من یک تکرد ہستم کہ راہ خود رااز غزلِ سنتی جدا کردم و در عینِ حال بہ مسیرِ عروضِ نیمائی و شعر بی وزن نہ پیوستم۔''(۶)

> ''سیمین نے قریباً ''۳۴'' نئی بحور اختراع کی ہیں اور خود ان پر کافی زیادہ کلام لکھ کر شعرا کو محوِ حیرت کر دیا ہے۔ ''خطی زِ سرعت واز آتش'' اس کا بین ثبوت ہے۔''(۷)

اس تمام ترابتکار و ابداع کے باوصف اس کا خیال ہے کہ یہ سب خود شعر کی مہربانی ہے میرا ذات کوئی کمال نہیں: ''بااین ہمہ من نیستم کہ کاری میکنم، شعر است کہ فرمان می دھد۔''(۸)

سیمین بہبہانی اپنے نظریہ شعر ،کلام (غزل) کی کثرت اور اشعار کی تعداد کے حوالے سے اپنے ایک معاصر محمد حسین شہر یار (۱۹۸۸ء) کے زیادہ قریب محسوس ہوتی ہیں۔ اس لیے

سیمین کو بجا طور پر جدید فارسی غزل کے حوالے سے شہر بانوی سخن کہا جا سکتا ہے۔ سیمین کی غزل میں بھی عام طور پر یہی رنگ ہے، مگر غزل میں غزل کا روایتی رنگ ڈھنگ قائم ہے مگر تقلیدی اور نقل نہیں یہاں سب ذاتی اور اپنا ہے اس نے ہر لحاظ سے نیا پن پیدا کر دیا ہے، اس نے روایت کے اندر رہ کر جدتیں متعارف کروائی ہیں جو نہایت مقبول اور مطبوع ہیں۔ مثلاً معاملاتِ عشق و محبت میں محبوب کی سراپا نگاری میں سیمین نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ محبوب کی آنکھوں کے مختلف زاویوں کو مختلف زاویوں کو دیکھا اور دیکھایا ہے مثلاً:

محبوب کی آنکھوں میں کوئی بات ضرور ہے کیا ہے؟ بس ہے!

گشتند پی فتنہ بہ ہر گوشۂ این شہر
در گوشۂ چشمانِ تو گویا خبری ہست![۹]

میں تو تیری آنکھوں میں ڈوب گیا ہوں کیونکہ تیری مسکراتی آنکھیں بڑے دھوکے دیتی ہیں:

کی زبانِ تو این توان دارد
چشمِ مست تو صد زبان دارد[۱۰]

سیمین آنکھوں سے آنکھوں کی بلائیں لیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

تا ازنگاہِ غیر بہ پوشم نگاہِ تو
مژگان شوم بہ حلقۂ چشمِ سیاہِ تو[۱۱]

محبوب کے قد کے بارے میں کہتی ہے کہ وہ تو سرو کو شرماتا ہے:

گر سرورا بلند بہ گلشن کشیدہ اند
کوتاہ پیشِ قدِ بتِ من کشیدہ اند[۱۲]

اسی لیے ڈاکٹر شکور احسن کو یہ کہنا پڑا:

"سیمین کی غزلوں میں بڑی رعنائی اور دلکشی ہے۔"[۱۳]

ایسے محبوب کو دیکھنے اور وہ بھی اکیلے میں دیکھنے کی آرزو سیمین میں بھی بڑی صمیم بھی ہے قدیم بھی اور شدید بھی:

بنہ کہ عمر درین آرزو تباہ کنم — کہ بی رقیب بہ رویت دمی نگاہ کنم
تو دور از منی ای نازنینِ من، بگداز — بیادِ چشم تو این نامہ راسیاہ کنم[۱۴]

اے محبوب! میں تجھے بالکل اکیلے میں ایک نظر دیکھنا چاہتی ہوں صرف ایک نظر اور میں یہ سب تیرے لیے لکھ رہی ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی انتظار بھری سیاہ آنکھوں سے تیرے گلابی گالوں پر سفید سفید موتی ٹپکاؤں کہ تیری نگاہِ دلدوز ایک عجیب قیامت برپا کرتی ہے:

رخ بر رخِ گلگونت می سایم و می گریم — نرگس شبرنگم برگل گہر اندازد
سیمین! بت مہ سیما زیبا ست ز سر تا پا — درد دل نگہش اما شوری دگر اندازد(۱۵)

میرا دل بھی چاہتا کچھ اور ہے اور کرتا کچھ اور ہے اور حسب معمول کا عمل ایسا ہی ہوتا ہے:

تابِ رسوائی ندارد این دلِ تقوا فروش
ورنہ زُہدِ راستین، کاری ست غیر از کارِ ما(۱۶)

حیران ہوں کہ عشق کا اظہار کیسے ہوا؟

راز عشق سینہ سوزم را، کدامین فاش کرد
لرزشِ گویای لب؟ یا خواہش خاموشِ چشم(۱۷)

ہم تو دراصل روزِ الست سے اس کی بندہ ہیں اور اس بندگی کے ممنون بھی:

رُوکرد ہما بخت وفتادیم بہ بندش — ماراچہ گنہ بود؟ خطا کرد کمندش
باآن ہمہ دلدادہ دلش بستہ ما شد — ای من بہ فدای دل دیوانہ پسندش(۱۸)

ہم تو اس سے آج تک یہی پوچھ رہے ہیں کہ ہمیں یہ ارمان بھرا دل کس لیے دیا تھا؟ ہمیں محبوبِ خلائق اور مسجودِ ملائک کیوں بنایا؟ اور یہ سب کر کے پھر ہمیں ہجر میں کیوں سلگا رہا ہے آخر کیوں؟

زچہ گوہر افریدی دل داغدار مارا؟ — کہ ہزار لالہ پوشد پس ازین مزارِ مارا
تن ماچرا بہ سوزی کہ خود این گناہ کردی — توکہ بوسہ گاہ کردی لب پُرشرارِ مارا
زسرشک نم فشاندم بہ بنفشہ زارِ دُوری — کہ زبو تہ ہا بہ چینی گل انتظارِ مارا(۱۹)

چاہتی ہوں کہ اے محبوب! اگر تو مجھے اپنے گھر سے نکل جانے کو بھی کہہ دے تو میں صبح کہوں آج شام چلی جاوں گی اور نہ جاؤں پھر کہوں کہ صبح صبح تو چلی ہی جاؤں گی مگر جاؤں نہ پھر دوسرے دن بھی یہ چکر چلتا رہے اور یوں میں ایک سو سال تک یہی عمل دہراتی رہوں:

گفتی اگر از کویِ خود، روزی تورا گویم "برَو"
گفتم کہ صد سالِ دگر، امروز و فردا می کنم(۲۰)

پتا نہیں یہ کیسے لوگ ہوتے ہیں؟ جو روتا تڑپتا چھوڑ کر خود دل کڑا کر کے چلے جاتے ہیں:

از دیدہ می روند و بہ دل جاگرفتہ اند　　اینان کہ دلشکستہ دلبستہ می رَوَند
زان اشک دانہ دانہ کہ پی در پی ہم است　　چون بندیان بہ سلسلہ پیوستہ می روند(۲۱)

ایسے لوگ جب پتا پوچھتے ہیں تو ہم جواب دیتے ہیں کہ شہر عشق کے باسی ہیں اور پاگل پن ہمارا پیشہ ہے اور تمہارا ہمارا وہی رشتہ ہے جو کسی چشم انتظار کا راہِ محبوب سے ہوتا ہے:

زمن مپرس کہ ام؟ یا کجا دیار من است　　ز شہر عشقم و دیوانگی شعارِ من است
منم ستارۂ شام و توئی سپیدۂ صبح　　ہمیشہ سوی رہت چشمِ انتظارِ من است(۲۲)

اصل بات تو یہ ہے کہ مجھے پیار ہو گیا ہے اور شدید ہو گیا ہے مگر میں نے اسے فضول بہانوں سے چھپایا، میں نے اس آتش بکف جذبہ کو دبایا مگر بری طرح ناکام ہوئی اب تو اطاعت یار ہی میرا دین اور ایمان ہے اور تیری آنکھ کے اشارے میرے سہارے ہیں:

دوست می دارم و بیہودہ پنہان می کنم　　خلق می داند و من انکارِ ایشان می کنم
دیدہ برہم می نہم تابستہ ماند سرِ عشق　　این حبابِ سادہ را سرپوش توفان می کنم
زان نگاہ گہر بائی چارہ فرمان بردن است　　ہر چہ می خواہی بگو آن می کنم آن می کنم(۲۳)

محبوب کی نگاہ کو گرمِ شکار کرنے کے لیے اسے یوں چھیڑا جاتا ہے کہ تو آج تھکی تھکی سی دکھتی ہے آخر کیوں؟

دیگر نگاہ گرم تورا تاب فتنہ نیست
ای چشم آشنا مگر امروز خستہ ای؟(۲۴)

میرا یہ کہنا تھا کہ اس نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی کہ میں تو تیار ہوں مگر تیری آنکھوں میں وہ تڑپ، دل میں وہ آرزو کی جولانی، سینہ میں وہ عشق کا شور باقی نہیں۔ تم مجھے بات کرتے ہو! یہ تو دیکھو کہ تم! جذبۂ محبت سے بالکل تہی ہو اور تم خود اپنی ہی قبر کے کتبے بنے ہوئے ہو:

دل از تموج رنگین آرزو خالی است　　شکوہ نور در آویزۂ بلور کجاست؟
میان معبد این سینہ ہائے بی معبود　　بخورِ شیفتگی، عطرِ عشق و شور کجاست؟
حقارت است و خموشی دراین تنفسِ برگ　　خروشناکیٔ توفانِ پُرغرور کجاست؟
بہ قلب ہاز محبت، نوشتہ نیست خطی　　نشان ونام براین سنگ ہائے گور کجاست؟(۲۵)

جب اس پر بھی محبوب پر کوئی اثر نہ ہوا تو عاشق یہ کہہ اٹھا کہ اے محبوب! کچھ تو بولو جب میں تجھے نہیں بھلا تو پھر تو نے مجھے کیوں بھلا دیا ہے؟ میری اندھیری دھول نے تیری گود سے کیا مانگ لیا تھا کہ تو میری پیار بھری گود سے بیزار ہوا اور چل دیا اور مجھے تنہائی کی اذیتوں کے سپرد کر گیا۔ اے میری سیاہ چشمی کی تعریفیں کرنے والے دیکھ ذرا میں تیرے بغیر سراپا ماتم ہوں اور یہ تو جانتا ہے کہ میری شاعری کی رعنائی تو تیری توجہ کا ثمر تھی میں تو تیرے اشارے پر شعر کہتا تھا اور اب تیرے بغیر بالکل ایک بے کلی سی چھائی ہے ایک مسلسل جلن ہے تڑپ ہے اور میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہوں کہ تو نے آخر مجھے کیسے اور کیوں بھلا دیا؟

سخن دیگر نگفتی ای سخن پرداز خاموشم فراموشت نمی کردم چرا کردی فراموشم؟
ز سردی ہای خاک تیرہ، آغوشت چہ می جوید چہ بد دیدی چہ بد دیدی، ز گرمی ہای آغوشم!
بہ جز در دیدہ ام، کی می پسندیدی سیاہی را؟ نمی بینی مگر اکنون کہ سر تا پا سیہ پوشم
تو آگہ کردی از لفظم، تو ساغر دادی از شعرم بہ دلخواہ تو می گویم، بہ فرمان تو می نوشم
نہ بی ہوشم نہ بی ہوشم نہ گریانم نہ خاموشم ہمیں دانم کہ می سوزم، ہمیں دانم کہ می جوشم
پریشانم، پریشانم، چہ می گویم؟ نمی دانم ز سودای تو حیرانم چرا کردی فراموشم؟[۲۶]

شاعرہ نے اس غزل کو انفرادی رنگ سے ہٹ کر ایک صوفیانہ انداز بھی دے دیا ہے۔ سیمین نے شاید اپنی ایسی ہی دلدوز غزلوں کے بارے میں کہا ہے اور کیا سچ کہا ہے کہ اے سیمین! تو نے اتنے پرسوز شعروں سے کیا فائدہ اٹھایا ہے؟ کہ اب ہو گا! لہٰذا ایسی غزلیں کہنے سے رک جاؤ! ورنہ تیرا دیوان تو ہر ایک کو جلا ڈالے گا:

چہ سودی بردہ ای سیمین ز شعر و سوز و سازِ غم؟
غزل سو زندہ کمتر گو، کہ دیوانِ تومی سوزد[۲۷]

سیمین پر التجا کرتی ہے کہ اے محبوب! میں نے ساری رات دروازے سے لگ کر تیرا انتظار کیا ہے اور اب سحر ہو گئی ہے اب تو آجا؟ میں نے رو رو کر، رات بِتا دی ہے اور ساری رات تیری یاد آآ کر ستاستا کر اور چھیڑ چھیڑ کر آتی اور جاتی رہی مگر تو نہ آیا اب رات دن سے مل رہی اور میرا رنگ اڑ رہا ہے اب تو آجا! اے محبوب! اگر تیرا خیال ہے کہ تو مجھے میرے مرنے پر اپنے دیدار سے دوبارہ زندہ کر دے گا تو سمجھ لے کہ وہ وقت آگیا ہے اب تو آجا! ذرا سی آہٹ ہوتی ہے تو میرا دل سوچتا ہے کہ کہیں یہ تو تو نہیں؟ کہیں یہ تو تو نہیں؟ اور میرے دل میں ایک ابال سا اٹھتا ہے اور

پھر میں دل تھام کر رہ جاتی ہوں اور سارا دن یہ عمل بار بار ہوتا ہے مگر تو تو نہیں آتا، اب تو آ جا! اور پھر دوسری رات شروع ہو جاتی ہے پھر کہتی ہے کہ اب تو دوسری رات بھی آ چلی ہے اور ستارے پھر سے مجھ برہن کو گھورنے لگے ہیں اب تو آ جا! اے محبوب! میرے ٹوٹے ہوئے دل کی آس تو ہی ہے اور اس سے پہلے پہلے آ جاؤ کہ لوگ مجھے نصیب جلی! نصیب جلی! کہہ کہہ کر پکارنے لگیں، تیری زندگی میں تو کم از کم ایسا نہیں ہونا چاہیے! اب تو آ جا! اب تو آ جا! اب تو آ جا!

ستارہ دیدہ فروبست و ارمید بیا — شرابِ نور بہ رگہای شب دوید بیا
زبس بہ دامن شب اشکِ انتظارم ریخت — گل سپیدہ شگفت و سحر دمیدبیا
شہابِ یادِ تو در آسمانِ خاطرِ من — پیا پی از ہمہ سو خطِ زر کشید بیا
ز بس نشستم باشب حدیثِ غم گفتم — ز غصہ رنگِ من و رنگِ شب پریدبیا
بہ وقتِ مرگم اگر تازہ می کنی دیدار — بہ ہوش باش کہ ہنگام آن رسید بیا
بہ گامہای کسان می برم گمان کہ توئی — دلم ز سینہ بردن شد زبس تپیدبیا
نیامدی کہ فلک خوشہ خوشہ پروین داشت — کنون کہ دستِ سحر دانہ دانہ چیدبیا
امیدِ خاطرِ سیمینِ دلشکستہ توئی — مرا مخواہ ازینِ بیش نا امیدبیا(۲۸)

اس غزل میں انتظار کی کیفیات کی عکاسی اور ان کی لحہ بہ لحہ تصویر کشی اور پھر ردیف میں بیا، بیا کی تکرار ایک علام سوز و ساز پیدا کر رہی ہے نیز سوز اور انداز پتھر میں دراڑیں ڈالتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور سیمین نے یہاں اپنے ذاتی تجربے کو آفاقی رنگ عطا کر دیا ہے۔ اس کی تاثیر سے نکلنا انتہائی مشکل ہے لہٰذا سیمین بڑے سادہ انداز میں اپنی غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہے کہ تیری غزل میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے:

چون شمع، مگر شعلہ زبان سخنت بود
کز سوزِ تو سیمین بہ غزلہا اثری ہست(۲۹)

اس کے بعد سیمین نے ایک عاشق اپنے محبوب کو کیا سمجھتا ہے اس کیفیت کا رنگ دکھایا ہے اور یوں آغاز ہوتا ہے کہ اے محبوب! تو تو جانتا ہی ہے کہ میرا غم، میری خوشیاں، میری امید آس، انتظار، خزاں، بہار، تو ہی ہے میری وصل کی زود گذر گھڑیاں اور محبت میں ڈوبے ہوئے چند لمحے، میرا مسکراتا ہوا ستارۂ شام تو ہی ہے۔ اور مجھے ساری دنیا کی دشمنی کا کوئی غم نہیں بشرطیکہ تو میرا ہے کیونکہ میری ہر آرزو کی امید گاہ تو ہی ہے:

مرا ہزار امید است و ہر ہزار توئی — شروعِ شادی و پایانِ انتظار توئی
بہار ہا کہ ز عمرم گذشت و بی تو گذشت — چہ بود غیر خزانہا اگر بہار توئی
دلم زہر چہ بہ غیر از تو بود خالی ماند — در این سرا تو بمان، ای کہ ماند گار توئی
شہابِ زود گزر، لحظہ ہائی بلہوسی ست — ستارہ ئی کہ بخند دبہ شامِ تار توئی
جہانیان ہمہ گر تشنگانِ خونِ منند — چہ باک زان ہمہ دشمن؟ کہ دوستدار توئی
دلم صراحیِ لبریز آرزو مندی ست — مرا ہزار امید است و ہر ہزار توئی(۳۰)

پھر سیمین محبوب کے حضور التجا اور خدا کے حضور دعا پیش کرتی ہے جو سب انتظار کے ماروں اور سب گناہ گاروں کی طرف سے ہے:

شبی نگاہ بہ روی امیدواران کن — سیاہیِ شبِ مارا ستارہ باران کن
تشنہ چون گل یخ دل بہ سرد مہریِ دوست — بہ بویِ او، ہوسِ گرمیِٔ بہاران کن
چون چنگ سر بہ گریبانِ شرم، افگندیم — بیا و گوش بہ آہنگ شرمساران کن
زعودِ سوزِ خدا عطرِ شعر و ساز آمد — نظر بہ سوختنِ ماگناہگاران کن
نہان بہ مخملِ خاکستریم ہمچو شرار — نسیم باش و گذاری بہ خاکساران کن
بہ یک نگاہ، پَر صبر ماتوانی سوخت — شہابِ خویش نشانگیرِ بیقراران کن
برآورا ز چمنِ طبعِ خویستن سیمین — گل نیازی و تقدیمِ نازدارانِ کن(۳۱)

اس دعا کے بعد التجا ہنوز قائم ہے اور خفیف سا گلہ بن کر سرد آہوں کو چیرتی ہوئی شکایت کا روپ دھار کر کہتی ہے کہ ہم بھی تیرے حسن آباد کے تسلیم نگر میں رہتے ہیں کبھی ادھر کا بھی قصد کر لیا کرو!

چہ کنم جز این کہ گویم بِنگر بہ لطف بنگر
دلِ گرمسوزِ مارا رخِ شرمسارِ مارا(۳۲)

ہمیں اپنے پیار کی ٹھنڈی دھوپ سے محروم نہ کرنا! بھلے کبھی کبھی ہی سہی مگر ملتے رہنا! ہم تو تیری اس التفاتِ گاہ گاہ کو بھی اپنے لیے سعادتِ دارین اور راحت کونین سمجھتے ہیں:

خورشیدِ بہمنی تو لطفت مدام نیست
اما خوشم بہ مرحمتِ گاہ گاہِ تو(۳۳)

محمد دھیم : سیمین بہبہانی کو جدید فارسی ادب کے آسمان کا تابندہ ستارہ قرار دیتے ہیں۔(۳۴) جبکہ سیمین نہایت عاجزی کے ساتھ یہ کہتی ہوئی نظر آتی ہیں: ''زندگی ام باشعر کہ بی شعر ہیچم و آنچنان شوریدہ بود در ہوای شعر و سخن دم می زنم کہ ہر چہ گفتنی یا نگفتنی است می گویم، باشد کہ از آن میان یکی شنیدنی باشد۔''(۳۵)

ای خوشا دولتِ آن مست کہ در پای حریف
سرود ستار نداند کہ کدام اندازد(۳۶)

یہ چند سطور تشنگی ہیں، تشفی نہیں، بلکہ یہ تو سیمین کی غزل اور اس کی رنگا رنگی اور نگار گری کا محض اختصاریہ اور اشاریہ ہیں مگر پھر بھی ان سے سیمین کی فکری، فنی، عروضی اور ابلاغی جدتوں کی جہتوں کا اندازہ بآسانی کیا جا سکتا ہے اور سیمین کو بجا طور پر جدید فارسی غزل کے حوالے سے شہر بانوی سخن کہا جا سکتا ہے۔ اردو اور فارسی کے عالمی ادبی تناظر میں فقط سیمین بہبہانی وہ شاعرہ ہیں جن کے مصرعوں کو خواجہ حافظ، پروین اعتصامی، محمد حسین شہریار، غالب اور اقبال کے برابر رکھا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات و حواشی

۱۔ سیمین بہبہانی، ۱۳۷۰ھ، ''رستہ خیز'' (دیباچہ) ایران، تہران، انتشارات زوار، ص۶
۲۔ سیمین بہبہانی ۱۳۶۹ھ، ''گفت وشنود'' (انٹرویو) مشمولہ، مجلہ دنیا سخن، شمارہ نمبر ۳۹، محمد معلم (مدیر) ایران، تہران، ص ۳۰
۳۔ سیمین بہبہانی، رستاخیز، ص۶
۴۔ حقوقی، محمد، ۱۳۷۷ھ، ''ادبیات امروز ایران'' ایران، تہران، نشر قطرہ، خیابان انقلاب، ص ۵۲۵
۵۔ یوسفی، غلام حسین، ڈاکٹر، ۱۳۷۷ھ، ''چشمہ روشن'' ج:۲، ایران، تہران، انتشارات علی، ص ۷۵۹
۶۔ سیمین بہبہانی، ''دنیا سخن'' ص ۳۴
۷۔ علی، حسن، محمد، ۱۳۷۳ھ ''از بہار کا شہر یار'' ج:۳، ایران، تہران، انتشارات ارغون، ص ۵۷۳
۸۔ سیمین بہبہانی، ''دنیا سخن'' ص ۳۳
۹۔ سیمین بہبہانی ۱۳۷۰ھ، ''چل چراغ'' ایران، تہران، انتشارات زوار، ص ۲۰
۱۰۔ ایضاً، ص۶۷
۱۱۔ سیمین بہبہانی، ۱۳۷۰ھ، ''جائی پا'' ایران، تہران، انتشارات زوار، ص ۲۱۱
۱۲۔ ایضاً
۱۳۔ عبدالشکور، احسن، ڈاکٹر ۱۹۹۹ء، ''مقالات احسن'' پاکستان، لاہور، جامع پنجاب، ص ۲۱۶
۱۴۔ سیمین بہبہانی ''جائی پا'' ص ۲۲۵
۱۵۔ ایضاً، چلچراغ، ص۔۸۸
۱۶۔ ایضاً، رستاخیز، ص ۲۵
۱۷۔ سیمین بہبہانی، ۱۳۷۰ھ، ''خطی و سرعت از آتش'' ایران، تہران، انتشارات زوار، ص ۲۴
۱۸۔ ایضاً، چلچراغ، ص ۱۲۳
۱۹۔ سیمین بہبہانی، ۱۳۷۳ھ، ''گزینہ اشعار'' ایران، تہران، انتشارات مروارید، ص ۱۱۳
۲۰۔ ایضاً، ص ۴۴
۲۱۔ ایضاً، ص ۵۴
۲۲۔ ایضاً، چلچراغ، ص ۱۳۷
۲۳۔ ایضاً، ''خطی و سرعت از آتش'' ص ۴۷
۲۴۔ ایضاً، چلچراغ، ص ۴۸
۲۵۔ ایضاً، ''رستاخیز'' ص ۲۷

۲۶۔ ایضاً، ص۴۹

۲۷۔ ایضاً، چل چراغ، ص۱۸

۲۸۔ ایضاً، ''گزینہ اشعار'' ص۱۰۷

۲۹۔ ایضاً، ''چلچراغ'' ص۲۰

۳۰۔ ایضاً، ''رستاخیز'' ص۵۷

۳۱۔ ایضاً، ص۳۵

۳۲۔ ایضاً، ''گزینہ اشعار'' ص۱۱۳

۳۳۔ ایضاً، ''چلچراغ'' ص۶۸

۳۴۔ دھیم، محمد، ۱۳۷۲ھ، ''مجموعہ گلہا'' ایران، تبریز، آذرآبادگان، ص۱۱۵

۳۵۔ سیمین بہبہانی، ''گفت وشنود''، ص۳۵

۳۶۔ سیمین بہبہانی، ۱۳۷۰ھ، ''دشت ارژن'' ایران، تہران، انتشارات ذوار، ص۱۵